ساقی ارباب ذوق
PDF BOOK COMPANY
یہ آواز کیا ہے
وزیر آغا

یہ آواز کیا ہے!

وزیر آغا

مکتبہ نردبان

ضابطہ

حقوق ———— بحق مصنف محفوظ

طبع ———— اوّل

ناشر ———— ایم۔ ڈی۔ شاد

خطاطی ———— محمد ارشد

سرورق ———— مُوجد

مطبع ———— طیب اقبال پرنٹرز لاہور

ماہ وسالِ اشاعت ———— مارچ ۱۹۹۵ء

قیمت ———— پچّاس روپے

مکتبہ نردبان ۱۰۹ اولڈ سول لائنز سرگودہا

لاہور میں ملنے کا پتہ

دفتر اوراق ۱۱۵/۳ سرور روڈ لاہور چھاؤنی

شاہد شیدائیؒ کے نام !

مصنّف کی دوسری شعری کُتب

شام اور سائے (نظمیں)

دن کا زرد پہاڑ (نظمیں اور غزلیں)

نروبان (نظمیں)

آدھی صدی کے بعد (طویل نظم)

گھاس میں تتلیاں (غزلیں اور نظمیں)

غزلیں

اک کتھا انوکھی (غزلیں اور نظمیں)

چہک اُٹھی لفظوں کی چھاگل (جُملہ شعری کتب ایک جِلد میں)

ترتیب

نظمیں :

اسے سی لوں تو تیرا ساتھ دوں مَیں
بدن پھر کترنوں سے بھر گیا ہے

تری آواز کا سا گر سُنائی دے!

کبھی بادل کے روشن چاک سے
تیرا گلاب ایسا بدن
کوندے کی صورت روشنائی دے
کبھی اک سنگدل جنگل کے اندر
کسی کہنہ شجر کی شاخ ٹُوٹے
لرزتا، خاک پر گرتا
اک اک پتا دہائی دے
جری کہسار کے اعماق میں غارِ حرا جاگے
مقدس لفظ کا بے ساختہ شعلہ دکھائی دے
کبھی دریا میں، ٹھہرے وقت کو
پتھر کی سِل توڑے

چمکتی جھاگ کا چھینٹا
سیہ پانی کے سینے پر
دمکتا، جھلملاتا، موتیوں کا ہار بن جائے
کبھی اس دم بخود موجودگی — اِس
بے نہایت، بے صدا، قرنوں پہ پھیلی تیرگی سے
اک کرن پھُوٹے
تری آواز کا ساگر سُنائی دے
تو مَیں بھی بادباں کھولوں
تری آواز پر لبیک بولوں
بدن کی بند مُٹّھی سے نکل کر
تری آواز کے دھاگے میں بندھ کر
تری جانب بڑھوں
جانب تری، بڑھتا چلا جاؤں!

○

تم جو آتے ہو!

تم جو آتے ہو
تو کچھ بھی نہیں رہتا موجود
تم چلے جاتے ہو
اور بولنے لگتے ہیں تمام
اَدھ کِھلے پھُول
سماعت پہ جمی چاپ،
ہَوا ، بند مکان
گفتگو کرنے کے آسن میں رُکے سب اجسام
مُردہ لمحات کا اک ڈھیر —— پہاڑ
ابر کی قاش ، اٹھی موج کا ساکت اندام
برف لب ، پلکوں پہ ٹانکے ہوئے موتی —— آنسو

اور سلے کانوں میں آواز کی سوئیاں ، بے جان
یک بیک بولنے لگتے ہیں تمام
زندگی ، بُننے میں ہو جاتی ہے پھر سے مصروف
وقت ہو جاتا ہے پھر خاک بسر ، بے آرام
اک پرندہ جسے اڑتے چلے جانا ہے خدا جانے کہاں
اور مَیں
تنکوں کے بکھرے ہوئے بستر کی طرح
منتظر ، لَوٹ کے تم
پھر سے چلے آؤ کسی روز یہاں
پھر ہوں اک بار معطّل
یہ زمیں —— اور زماں !!

○

یہ آواز کیا ہے!

یہ آواز کیا ہے ؟
یہ آواز جو رینگتی ، شور کرتی
مری روح کی گنگ دنیا کے اندر اترنے لگی ہے
تمہیں کیوں سنائی نہیں دے رہی ہے ؟

یہ آواز کیا ہے ؟
کسی بند کوچے کے پاتال میں
جیسے کوئی شرابی
بڑے زور سے گھر کا دروازہ پیٹے
سیہ ، ننگی ، بدبو بھری گالیوں کے جلو میں
عجب شان سے

گھر کے بے نُور مرقد میں اُترے
بُجھے سرد چولہے سے ٹکرائے
چیخے
کہے : تم کہاں ہو ؟
کہاں مر گئی ہو ؟
کہاں مر گئی ہو ؟!

معاً اس پہ اندھا، غصیلہ، اکیلا مکاں
چاروں جانب سے اُمڈے
اُسے اپنے خونخوار پنجوں میں جکڑے
خنک خوف کی لہر سی
اس کے سارے بدن میں سرکنے لگے
اور پھر
جیسے اپنے ہی اندر کے گہرے کنوئیں سے کوئی بولتا ہو
وہ رُک رُک کے
آنسو بھری گیلی آواز کی
دھجیوں میں ڈھلے
اور کہے :
تم ....

تم ......کہاں

تم ..... کہاں ..... مر..... گئی ہو !!

یہ آواز کیا ہے ؟

یہ آواز جس کی دہکتی ہوئی کرچیاں

آنسوؤں میں بُجھی

بس بھرے ڈنک لے کر

بھڑکتی ہوئی شہد کی مکھیاں بن گئی ہیں !

یہ آواز جو کُہنہ پیڑوں کے جنگل میں

پاگل ہواؤں کا نوحہ نہیں ہے

پہاڑوں میں بھٹکی ہوئی گونج

بادل کی ہر دم اُدھڑتی ہوئی گرم چادر سے

بجلی کی برہم لپک

گول دھرتی کو

سینگوں پہ اپنے اٹھائے

رمبھاتے ہوئے بیل کی ہُو ـــــ

جہازوں کے پنجوں سے

گرتے دھماکوں کا اک سرمئی سلسلہ بھی نہیں ہے

یہ آواز جو اپنے بچّوں سے بچھڑی ہوئی

تُندخو شیرنی بھی نہیں ہے
یہ آواز کیا ہے ؟

سُنو ! کیسی دلگیر، غم ناک آواز ہے یہ
جو شاید زمیں کے شگافوں سے آنے لگی ہے
زمیں، ہاں زمیں جیسے رونے لگی ہے
کہ وہ آج اپنے ہی تن پر لگا زخم ہے
خشک ہونٹوں پہ ٹھٹھری ہوئی چیخ ہے
اس نے جانے کہاں سے
یہ رونے کا انداز سیکھا ہے
چُپ چاپ
شبنم کی صورت یہ دُکھیا صدا
قطرہ قطرہ
مری روح کی گُنگ دُنیا کے اندر
ٹپکنے لگی ہے
تمہیں کیوں سنائی نہیں دے رہی ہے ؟؟

○

تھری سکور اینڈ ٹِن !

میں جب کورے کاغذ ایسا
کھڑکھڑ کرتا ، شور مچاتا ، اک بچّہ تھا
میری ماں مجھ سے کہتی تھی :
چُپ کر
اتنا شور کیا تو تیری ننھی بہن بچاری جاگ اٹھّے گی
جاگ اٹھّی تو
دُور پہاڑ کی اُس چوٹی سے
بادل ایسی لمبی چِٹّی داڑھی والا کالا بابا
نیلی پیلی آنکھیں جس کی
سُرخ عنابی منکوں کی اک مالا پہنے
مُٹھّی میں اک چمٹا تھامے
پنجے میں کشکول اٹھائے
بھاپ اڑاتا

شور مچاتا

دھڑ دھڑ نیچے آ جائے گا

اور کالے کشکول میں تجھ کو بند کرے گا

پربت کی چوٹی پر تجھ کو لے جائے گا !

ماں کہتی تھی

اور مَیں ماں کی گود میں ڈر کر سو جاتا تھا

آج مگر مَیں جان گیا ہوں

بابا — اک دن، پربت سے سچ مچ آیا تھا

گھر کے اندر آن گھسا تھا

اور مجھ کو

کشکول میں اپنے ڈال کے کتنا سُکھی ہُوا تھا

بِھکشا لے کر

بِھکشا پاتر کو لہراتا

بھاگ گیا تھا !

ستر، کھڑ کھڑ کرتے، شور مچاتے سال تو سارے

اک لمحے میں بیت گئے ہیں

اور پربت کی چوٹی پر

مَیں — بادل ایسی داڑھی والا کالا بابا

کاغذ کا کشکول اٹھائے

سوچ رہا ہوں

کیا مَیں بھی اس پربت کی چوٹی سے اتروں ؟

نئے جنم کی بھکشا لینے

مَیں بھی جاؤں ؟!

○

پہلی رنجش کے بعد

ابھی کھُلا ہے
روشنیوں کا فرغل پہنے
سڑک کنارے آبیٹھا ہے!

چلو، اسی میں چلتے ہیں
آؤ اس گوشے میں بیٹھیں
جہاں اندھیرا اور اجالا
جانے کب سے
جلتی بجھتی سرگوشی کا ریشم اوڑھے
مست پڑے ہیں!

دیکھو، اُس دیوار پہ اژدر
اپنا سایہ چھوڑ گیا ہے

کینچل سے آزاد ہُوا ہے
شیشے کے اِس "گھر" میں دیکھو
ساگر سا اک بند پڑا ہے
اور ساگر میں
سرخ، سنہری، ننھی منی جانوں کا
اِک شہر بسا ہے !

کتنا سکوں ہے !
کہو— "سکوں ہے"
چھوٹی چھوٹی
چبھنے والی، زہریلی، بے ہنگم باتیں
دروازے پر اُن کو جیسے
ڈیوڑھی بان نے روک لیا ہے
تم بھی اپنے آنسو روکو
سُوپ پیو
یہ نُوڈل چکھو
مچھلی کے یہ قتلے کھاؤ
اور منگاؤں ؟

اچھا! — اب قہوہ ہو جائے
پی کر دیکھو، بُرا نہیں ہے
تلخی کا بھی ایک مزہ ہے
دُکھ کے ساتھ بھی رہنا سیکھو
میرے ساتھ بھی رہنا سیکھو !

سانپ اور سیڑھی!

زینہ — جیسے دستِ دُعا ہے
رحم کا طالب
پَل پَل سو سو رنگ بدلتے
زہر بھرے آکاش کی جانب
دیکھ رہا ہے!

اور فلک اِک ناگ ہے جس نے
اپنا کینچل
تن سے اتار کے پھینک دیا ہے
تاروں کا بل کھاتا جھُرمٹ
حدِّ نظر تک پھیل گیا ہے!

مَیں زینے پر

قدم قدم اوپر کو اٹھتا

کینچل کو رستے سے ہٹاتا

اک بے انت خلا کے اندر

کتنی بار گیا ہوں لیکن

جب بھی مَیں نے

" ہونے " اور " نہ ہونے " کی سرحد کو چھُوا ہے

ناگ نے مجھ کو نگل لیا ہے

اور مَیں چکنے غار کے اندر

بے بس ہو کر پھسل گیا ہوں

واپس خاک پہ آن گرا ہوں !!

جرسی !

اُدن کے شانت سمندر کے اندر جب
نازک مخروطی پوروں نے جھانکا
تہ میں اُتر کر
لاکھوں برسوں پر پھیلی بے انت سمادھی کو
توڑا
تو رنگوں کا اک فوّارہ بیدار ہُوا
اُدن کے دلکش دھاگوں میں کُہرام مچا
سُرخ ، عُنابی ، زرد ، قرمزی
دھاگوں کی صد ہا لہروں نے
پوروں کے شیتّو ناچ میں مل کر رقص کیا !

رقص کیا —— پر تیری مخروطی پوروں نے
کس ممتا سے کنگھی کر کے

سب گرہوں، سب "اٹکوں" کو ہموار کیا !

اور اب اُون کی برہم موجیں
شانت پڑی ہیں
گرہوں اور حلقوں میں بٹ کر
جرسی کے بے داغ بدن پر نقش ہُوئی ہیں
قوسِ قزح کا عکس بنی ہیں
نازک مخروطی پوروں نے
اُون کا اک "منظر" سا بُنا ہے
کس ممتا سے
مجھ متلاطم سمندر کو ہموار کیا ہے !!

چُپ بیٹھے کیوں اپنا آپ گنواتے ہو ؟

ہر دیوی کا
کوئی نہ کوئی پُوجنے والا بھی ہوتا ہے
کوئی نہ کوئی
کٹ جانے ، مر جانے والا
چاہنے والا بھی ہوتا ہے !

تم بھی کوئی پتھّر ڈھونڈو
کومل پوروں ، میٹھے بولوں
سُرخ عنابی پھُولوں ، گیتوں
اور نازک سپنوں سے تم بھی
اس پتّھر کو صورت بخشو
ہونٹ تراشو ، آنکھیں کھودو
قوسیں کھینچو

اقلیدس کے سارے منتر
اُس پر پھونکو
پتھر کو پیکر میں ڈھالو
پھر اس کو سکھلاؤ — جینا
میٹھی میٹھی باتیں کرنا
شرمانا، پلکوں کو اوڑھ کے چھُپنا
خوشبو بن کر اُڑتے پھرنا
کبھی مدھر گیتوں میں ڈھلنا
کبھی تمہاری یاد میں رونا
آہیں بھرنا
پہروں خود سے باتیں کرنا
اور تم کو
"پتّھر دل" کہنا
اور تم کو "پتّھر دل" کہنا !

تم بھی پتھر بن کر دیکھو
تم بھی کومل پوروں
میٹھے بولوں کے جادو کا منظر دیکھو
تم نے ساری عمر تماشہ ہی دیکھا ہے

اب تم خود بھی
ایک تماشہ، بن کر دیکھو!

ہر ہستی کا
کوئی نہ کوئی
چاہنے والا بھی ہوتا ہے
تم بھی خود کو 'چاہنے والا'
اپنی خاطر کٹ جانے، مر جانے والا بن کر دیکھو
"جی" کر دیکھو!

چُپ بیٹھے کیوں اپنا آپ گنواتے ہو؟!

O

اور اب سُنا ہے!

وہ چکنی مٹی کی اک ڈلی تھی
طواف کرتی رہی جو ہر پل
جو رات دن کی طویل مالا گلے میں ڈالے
دیے کو مرکز بنا کے پروانہ وار گھومی
اُسے خبر تھی
طواف میں کتنی برکتیں ہیں
طواف میں کتنی عظمتیں ہیں
طواف میں ہے بقا ہماری
وہ جانتی تھی!
وہ جانتی تھی کہ دائرے کا سفر
عبادت ہے
ریشمیں سلوٹوں سے، دھاگوں سے

قرغلوں سے نجات پانے کا سلسلہ ہے!

وہ چکنی مٹی کی اک ڈلی تھی
طواف کرتی رہی جو ہر پل
اسے خبر بھی ہوئی نہ کیسے
خود اس کے اندر سے جھرنا پھوٹا
خود اس کے بھیتر سے پیاس اُمڈی
خود اس کے گیلے گھنے مساموں سے سبز کائی
ہمکتی آئی
اور اس کے تن کی مسافتوں میں
مہکتی، لہراتی گھاس مخمل کا بن کے آنچل
کچھ ایسے پھیلی
برہنگی کی طناب ٹوٹی
چھپانے چھپنے کی ریت جاگی
تمام دھرتی دلہن کی صورت
گلاب گلیوں، مہین پردوں
لجاتی پلکوں میں چھپ گئی
اوڑھ لی اس نے دھند چادر!

اور اب سُنا ہے
دہکتے سُورج کے گرد اُس نے
طواف کرنا بُھلا دیا ہے
کہ اب وہ بھاری لباس پہنے
خود اپنے محور پہ گھُومتی جا رہی ہے ہر پل
اُسے تو اب یاد بھی نہیں ہے
طواف کیا ہے
طواف میں کتنی برکتیں ہیں
طواف میں کتنی عظمتیں ہیں!!

تُو !

پتھر کا سایہ بھی پتھر
اور جہاز کا سایہ جیسے
کانٹے کی نتھ پہنے مچھلی
زخمی اور بے حال !

پتّوں کی چھلنی سے جیسے
اُترے پیلی دُھوپ
پیلی دُھوپ کے سائے کی
اک جھلمل کرتی شال !

کالی بوجھل پلکوں کے
قدموں میں اک پرچھائیں
آنسو کی شبنم میں بھیگے

دو سونے کے گال !

تُو ـــ اک حرف
جُگوں پر بھاری
انت، بے انت کے سب سایوں سے
آنسو، پتّھر، دُھوپ ـــ سبھی سے
اونچا تیرا کال !
مَیں تجھ حرف کا چھلنی سایہ
مَیں سایوں کا جال !!

ہم رو رو کر ہلکان ہوئے !

ہم خوب ہنسے ، ہم خوب ہنسے
جب بھونرا پھُول پہ آبیٹھا
اور پھُول کا اس نے خون پیا
ہم خوب ہنسے !

اِک چڑیا
پیلی آنکھوں والی
نازک نازک پنکھوں والی
چونچ میں بھونرا لے آئی
پھر ننھی مُنی چونچوں نے
جب شور کیا
ہم خوب ہنسے !

اک شِکرا
ٹیڑھے پنجوں والا
گہرے خونی دیدوں والا
سمٹا
تیر کی صورت جھپٹا
ہم نے دیکھا
برف کے گالے
پَر مٹیالے
چاروں جانب بکھر گئے
جب بکھر گئے
ہم خوب ہنسے !

اک بادل ــــ پاگل، آوارہ
پربت سے ٹکرا لے بیٹھا
اک دھار فلک سے پھُوٹ بہی
اور ندیوں میں ہیجان آیا
سب دریا بے زنجیر ہوئے
کھلیان بہے
انسان بہے

پھر لاشیں اُونچے پیڑوں کی
شاخوں میں جا کر اٹک گئیں
جب اٹک گئیں
ہم رونے لگے
ہم رو رو کر ہلکان ہوئے !

پہاڑ کیسی عجیب شے ہے!

پہاڑ کیسی عجیب شے ہے!
جو چشمِ صحرا سے اس کو دیکھو
تو اس کے پتھر بدن کو تم
اک پُرانے مرقد کا سایہ مانو
شکستہ اہرام اس کو جانو
مگر جو تم اس کے پاس جاؤ
کہو کہ — "مَیں اک تھکا مسافر
بہت ہی پیاسا
ہزاروں برسوں، کروڑوں میلوں کا فاصلہ
مَیں نے طے کیا ہے
اور اب کہ پہنچا ہوں تیرے دَر پر
تو آنکھ کیوں تُو نے میچ لی ہے
بدن کو پتھر بنا لیا ہے؟!"

— اگر کبھی تم یہ کام کر لو
اگر کبھی تم یہ کام کر لو
تو جان لینا
پہاڑ ظالم نہیں ہے اتنا
کہ چپ کی پتھریلی چاپ میں وہ مگن رہے
تم سے کچھ نہ بولے !

پہاڑ کیسی عجیب شے ہے !
جو تم کبھی اس کے پاس جاؤ
تو اپنے پتّھر بدن کو پیچھے ہی چھوڑ جانا
یا نرم بدلی میں چھُپ کے جانا
پگھل کے، آنسو کی بھیگ بن کر
تم اس کے چرنوں میں بیٹھ جانا
تو جان لینا — پہاڑ
بنجر نہیں ہے یکسر
پہاڑ خوابیدہ آبجُو ہے
پہاڑ خوشبو کی ابتدا ہے
پہاڑ سے "لفظ" پھُوٹتا ہے !!

بہتّرویں سالگرہ پر!

چلو یہاں تک پہنچ گئے
اب آگے رستہ کچّا ہے
دُور دُور تک یخ دھرتی ہے

یخ دھرتی پر
ٹھنڈی گیلی ریت بچھی ہے
ریت کے اوپر
آگے جانے والوں کے
قدموں کے نشاں ہیں
کچھ تازہ، کچھ بجھے ہُوئے ہیں!

مَیں آیا تو
بدلی کے غرغل میں لپٹی
اک بستی نے

آنکھیں مَل کر مجھ کو دیکھا
اور پھر اتنا خوش ہو کر وہ رُوئی پگلی
جل تھل کر دی دُنیا اُس نے
کیسے پیارے لوگ تھے جن کے
چہرے بھی اب یاد نہیں ہیں
بس ان کی آوازیں اب تک
کانوں میں رس گھول رہی ہیں
یا پھر ان کی خُوشبو ہر شب
پھُولوں کے جسموں پر اپنے پاؤں دھرتی
مجھ مورکھ کے تن سے آکر ٹکراتی ہے
اور پھر کہیں نہیں جاتی ہے !

کیسے پیارے لوگ تھے جن کی
خاک بھی اب رستوں میں نہیں ہے
اب تو ٹھنڈی ریت ہے جس پر
جانے والوں کے قدموں نے
قدموں کی بھاشا میں اپنی
امر کہانی لکھ ڈالی ہے !

کیسی بستی اُگ آئی ہے !
اجنبی چہروں والی بستی
کیوں اتنے بے دید ہیں یہ سب
کون ہیں یہ سب ؟
جانے والوں کی ہر چیز پہ جن کا قبضہ ہے
بس ان کی آوازوں سے
اور خُوشبو سے
اور ان کے جاتے قدموں کی مُہروں سے
ان کو غرض نہیں ہے !!

(

تم اگاؤ دھوئیں کے مرغولے!

برچھیاں رعد کی مرے تن میں
نصب تھیں اور ہواؤں نے مجھ کو
تیز دانتوں سے یوں بھنبوڑا تھا
اور سمُوں نے نجانے کتنی بار
مجھ کو روندا تھا جیسے مَیں کوئی
ان کے دشمن کی نعش تھا جس کا
روندنا ہی وظیفۂ جاں ہو!

تُند بارش مجھے شعاعوں کی
روز و شب گھولتی ہی جاتی تھی
ناگ — پُھنکارتے ہُوئے بھونچال
ڈس رہے تھے، نگل رہے تھے مجھے
اور پرندے غلیظ چونچوں سے

نوچتے جا رہے تھے کھال مری !

اور اب آ گئے ہو تم سارے
گولیوں اور بموں کے بیج لیے
ہل کدالوں سے لیس ہو کر تم
آ گئے ہو
تو جوت لو مجھ کو
اور اُگاؤ دھوئیں کے مرغولے !

○

لگتا ہے اب بارش ہو گی !

لگتا ہے اب بارش ہو گی
دھان کے سُوکھے کھیتوں پر
سب خاک اڑاتے رستوں پر
جو قدموں میں پامال ہوئے ہیں
دُھوپ کی مَیلی چادر اوڑھے
جن کو لاکھوں سال ہوئے ہیں
لگتا ہے اب بارش ہو گی !

لگتا ہے اب بارش ہو گی
تِنکا تِنکا پلکوں پر
پلکوں سے چِمٹے خوابوں پر
خوابوں میں بند جزیروں پہ
سب خالی دودھ کٹوروں پر

سب بچّوں پر
سب سُوکھے پیاسے ہونٹوں پر
سب پانی کے رکھوالوں پر
اور سیس کٹانے والوں پر
اب بارش ہوگی
لگتا ہے اب بارش ہوگی !!

○

اک بھاری آواز !

اک بھاری آواز بچھی ہے
پہلے دن سے آخری دن تک
اک بھاری آواز

بچھی ہے
جس کا کوئی انگ نہیں ہے
جس کا کوئی انت نہیں ہے !

عمریں گزریں
اس بھاری آواز کے تن سے
چھوٹی چھوٹی نرم صدائیں
انکھوؤں کی صورت پھُوٹی تھیں
منقاروں پر ثبت ہوئی تھیں
کتنی شکلوں ، کتنی لہروں

کتنے شیریں ہونٹوں کی چہکار بنی تھیں !

کسے خبر تھی
ایسا بھی اک دن آئے گا
یہ بھاری آواز ہمیں جب
پھر سے ابد کی آخری حد تک بھی ملے گی
مَیں سوچوں گا
تم پوچھو گی :
اس بھاری آواز کا کوئی
انگ بھی ہے ؟
اس بھاری آواز کا کوئی انت بھی ہے ؟ !

دیکھو! کیسے دُکھ لایا ہُوں !

دُکھ نشہ ہے
دُکھ کی جب عادت ہو جائے
سُکھ پھر کب اچھا لگتا ہے !

کیسے میٹھے دن تھے وہ بھی
پَو پھٹتی تو چڑیاں مل کر شور مچاتیں
حمد کے بول لبوں پر اُگتے
بادل کے گُلنار بدن سے
گول مٹول، سنہرا سُورج
رس پیتا، پھر مُسکاتا
پھر اس کی مخمل ایسی پوریں
شہر کے میناروں سے پھسل کر
گنبد اور محراب کو چھُو کر

گلیوں اور بازاروں کو سہلانے لگتیں
شہر کے بچّے
باغ کی گیلی گھاس پہ پھرتے
شُوٹ لگاتے
جب تھک جاتے
لیکن وہ تھکتے ہی کہاں تھے !

اور اب سُورج
صبح سویرے
لفظوں کے انبار اٹھائے آجاتا ہے
"دُکھ لے لو ! دُکھ لے لو جی !"
وہ چیخ چیخ کر کہتا ہے
"دُنیا بھر کے دُکھ لے لو جی !
نشہ بازو !
دیکھو کیسے بالکل تازہ دُکھ لایا ہوں
گرم، کرارے دُکھ لایا ہوں !! "

۱۹۹۵

آجاؤ تم
دستک مت دو
اب کے برس دَر بند نہیں ہے !

شام کے تارے نے پوچھا تھا :
بابا !
اب کی بار یہ دَر کیوں بند پڑا ہے
کیا تم دَر کو قفُل لگانا بھول گئے ہو ؟

مَیں نے کہا تھا :
کب بھُولا ہوں شام کے تارے
لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں
تُو بھی تو ہر شام چمک کر

قُفل سا بن کر
رات کے دَر پر لگ جاتا ہے
لیکن جب وہ پوُرب والا
کرنوں کا اک گچھا لے کر
آجاتا ہے
تُو از خود ہی کھُل جاتا ہے
پھر اس رسم کا حاصل کیا ہے ؟

اور تارے نے مجھ سے کہا تھا :
مَیں چاکر ہوں
چاکر کا تو کام ہی یہ ہے
قُفل لگانا ، رسم نبھانا
ورنہ اُس چِت چور کے آگے
قُفل کہاں رہ سکتا ہے ؟

آجاؤ تم
دستک دینا ، رسم نبھانا چھوڑو — تم کو
آنا ہے
سو آجاؤ !!

چُپ رہوں اور اُسے ملال نہ ہو
اَن کہی کا تو ایسا حال نہ ہو

ہر برس خود سے میں یہ کہتا ہوں
یہ برس بھی اُسی کا سال نہ ہو

قفل کیسے کھلے گا اُس لب کا
میرے لب پر اگر سوال نہ ہو

صبح کے بے نشان قدموں میں،
تیرگی ! یوں تو پائمال نہ ہو

خستگی عمر کی نہ اوڑھ ابھی
شام سے پہلے خستہ حال نہ ہو

تیرا ملنا ہے گر محال تو کیا
تیرا ملنا اگر محال نہ ہو

ہے اگر قہقہوں کی سنگ زنی
آنسوؤں کا بھی کوئی کال نہ ہو

چاندنی کی ردا ہی مل جائے
دھوپ کی گر نہیں ہے شال نہ ہو

ہوں اکیلا بھرے زمانے میں
کوئی مجھ سا بھی بے مثال نہ ہو

○

شاخ سوئی ہے، ثمر جاگتا ہے
شہر سنسان ہے، گھر جاگتا ہے

ہم نے مانا کہ اندھیرا ہے فقط
کیا کریں، سینے میں ڈر جاگتا ہے

لفظ مفہوم سے ڈرتا ہے سدا
حرف بے خوف و خطر جاگتا ہے

نام سے اُس کو بُلا کر دیکھو
کچھ تو بولے گا اگر جاگتا ہے

آ گیا وہ تو یہ جانا ہم نے
کیسے دیوار میں در جاگتا ہے

اُس کو اندھا نہ سمجھ دیکھتا ہے
زور سے بات نہ کر، جاگتا ہے

کھُل گئی آنکھ تو کیا دیکھتا ہوں
رات سوئی ہے سفر جاگتا ہے

آشنا جس سے ہوتے نا آشنا ہوتا گیا
پھُول سے خوشبو بنا اور پھر ہَوا ہوتا گیا

دُور جاتے قافلے نے مُڑ کے دیکھا بھی نہیں
بَس صدا دیتا رہا وہ بے صدا ہوتا گیا

مختصر سی عمر میں کیا کیا نہ تو نے غم سہے،
ناخدا پہلے ہُوا اور پھر خدا ہوتا گیا

ہم سمٹ کر اور بھی آتے گئے اپنے قریب
دُور جتنا ہم سے وہ ہوتا گیا، ہوتا گیا

جب تلک آیا نہیں تھا سامنے تو قہر تھا
آگیا جب سامنے بے دست و پا ہوتا گیا

اک ذرا سی لغزشِ لب نے دیا کیسا صلہ
شرم سے پلکیں جھکیں، چہرہ حنا ہوتا گیا

ہے رگوں میں اب رواں کچھ اور ہی ورنہ کہاں
بدزبانی اُس نے کی اور مَیں دُعا ہوتا گیا

O

کتنی بار پُکارا ہَیں
اِک بُجھتا انگارہ ہَیں

تن مورت اک مٹّی کی
اور پانی کا دھارا ہَیں

آگ لگی تو راکھ ہوئے
بن ، بنسی ، بنجارہ ، ہَیں

ایک ہی پھول کی خوشبو کو
کب تک کروں گوارا مَیں

اُس کی باتیں پتھر سی
اور شیشہ بے چارہ مَیں

کیسی انوکھی جنگ ہوئی
جیتا مَیں، اور ہارا مَیں

پہلے بھیگیں پلکیں مری
بھیگ گیا پھر سارا مَیں

آگ بھرا اک دریا تُو
ٹھنڈا ٹھار کنارا مَیں

○

سحر نے آ کر مجھے سُلایا تو مَیں نے جانا
پھر ایک سپنا مجھے دکھایا تو مَیں نے جانا

بجز ہَوا اب رُکے گا کوئی نہ پاس میرے
اندھیری شب میں دیا بجُھایا تو مَیں نے جانا

گیا یہ کہہ کر کہ ایک شب کی ہے بات ساری
مگر نہ جب لَوٹ کر وہ آیا تو مَیں نے جانا

مَیں ایک تنکا رُکا کھڑا تھا ندی کنارے
ندی نے بہنا مجھے سکھایا تو مَیں نے جانا

سیاہ بادل میں برق کوندی تو سب نے دیکھا
تری ہنسی نے مجھے رُلایا تو مَیں نے جانا

مَیں اوڑھ کر خود کو سو گیا تھا کہ بے خطر تھا
کوئی پرندہ جو پھڑپھڑایا تو مَیں نے جانا

ہے میرے سینے میں سخت پتھّر سی چیز کوئی
یہ آج تُو نے مجھے بتایا تو مَیں نے جانا

مَیں تیری نظروں سے گر چکا تھا مگر جو تُو نے
مری نظر سے مجھے گرایا تو مَیں نے جانا

ہَوا میں شامل تھی تشنگی اس کے تن بدن کی
ہَوا نے میرا بدن جلایا تو مَیں نے جانا

نافۂ لفظ کی خوشبو کا بکھرنا دیکھیں
اپنی آواز سُنیں، اُس کا سمٹنا دیکھیں

پونچھ لیں آنکھ سے بھیگی ہوئی یادیں اس کی
عارضِ شام پہ تاروں کا اُترنا دیکھیں

لب کشائی تو بہت زخم کی دیکھی ہم نے
وہ بھی دن آئے کہ ہم زخم کا بھرنا دیکھیں

پوچھ لیں تیز پرندوں سے سفر کا انجام
خاک پر ٹوٹے ہوئے پَر کا اترنا دیکھیں

جال پھینکیں کبھی اُس کالی گھٹا میں ہم بھی
اور پھر جال میں بجلی کا تڑپنا دیکھیں

○

اتنے چپ چاپ کبھی رات کے تارے بھی نہ تھے
اور یوں مُہر بہ لب زخم ہمارے بھی نہ تھے

کیسی عجلت میں کیا اپنوں نے اقرارِ شکست
ہم ابھی پوری طرح جنگ تو ہارے بھی نہ تھے

شب کی تزئین کی خاطر ہمیں جانا ہی پڑا
شام کے کام ابھی ہم نے سنوارے بھی نہ تھے

کاغذی ناؤ تھی منجدھار میں دَم توڑ گئی،
پاس پتوار بھی تھے دُور کنارے بھی نہ تھے،

رات تھی، ریت تھی، بے نُور سفر تھا، ہم تھے
سمت ناپید تھی گردوں سے اشارے بھی نہ تھے

اُس کے پیکر کو سمجھنے میں ہوئی عمر تمام،
نقش اُس کے ابھی ہم نے تو اُبھارے بھی نہ تھے

کیوں زمانے نے ہدف ہم کو بنایا تھا کہ ہم
خاک زادے بھی نہ تھے راج دُلارے بھی نہ تھے

آ گئے کرچیاں پھولوں کی لیے آج وہ پھر
ہم نے احسان ابھی اُن کے اُتارے بھی نہ تھے

○

اے مری آنکھ کے ستارے، بول
ڈر نہیں مجھ سے غم کے مارے! بول

سیلِ غم تُو نے سہہ لیا چُپ چاپ،
اب تو ٹوٹے ہوئے کنارے بول،

آنکھ چہکی، کلی نے لب کھولے
تُو بھی اے صبح کے شرارے، بول

راگنی چھیڑ نرم بُوندوں کی
اپنی بولی میں اَبر پارے، بول

دُھند کے چاک سے مجھے پہچان
آنسوؤں میں نہ کر اشارے، بول

تیز تلوار ایسا سناٹا،
اور سہمے ہوئے ہمارے بول

نازک غنچے آس بھرے
لب بستہ، بُوباس بھرے

آنکھیں، میٹھی آگ بِنا،
کاکُل، سُوکھی گھاس بھرے

لشکر سُنڈی چاٹ گئی
اُجلے کھیت کپاس بھرے

تم شہروں کے عطر گلال
ہم مُورکھ بن باس بھرے

مینہ سونے کے سکّوں کا
اور دامن افلاس بھرے

رنگوں کی برسات میں بھی
نین تمہارے پیاس بھرے

کیسا ہے انصاف ترا
کرے بھگت اور داس بھرے

( )

وہ ستارہ ہے بے مثال تو کیا
اُس کا ملنا ہے گر محال تو کیا

مَیں ہوں کسبِ کمال پر نادمؔ
وہ ہُوا صاحبِ کمال تو کیا

کتنے صد رنگ پیرہن اِس کے
ہے یہ سب کچھ اگر 'خیال' تو کیا

پاس تیرے ہیں مہُر بند جواب
سوچتا ہوں کروں سوال تو کیا

کوئی خُوشبو رہی نہ اب چہکار
پھُول کھلتے ہیں ڈال ڈال تو کیا

خوش رہو ساکنانِ خِطّۂ شام
میری آنکھیں ہیں برشگال تو کیا

تم بضد تھے کہ چاند رات آئے
اب ستارے ہیں خال خال تو کیا

○

کبھی حباب، کبھی موجِ آب کی صورت
کبھی رُکوں تری پلکوں پہ خواب کی صورت

گراؤ مت اِسے، آبِ صفا ہے یہ، ورنہ
پھرو گے کاسہ لیے ماہتاب کی صورت

وہ چل دیا تو نجانے کہاں سے ٹُوٹ گرے
ہزاروں پاتِ غمِ بے حساب کی صورت

عطا کرو بھی تبسم تو زہر خند کے ساتھ
کرم کرو بھی تو جیسے عتاب کی صورت

گئے برس جو ہُوا سو ہُوا، اُسے چھوڑو
نیا برس تو نہ آئے عذاب کی صورت

مگر نہ ایسے کہ تتلی کے پَر بھی جل جائیں
تم آؤ شوق سے روزِ حساب کی صورت

ورق ورق نہ مَیں ہو جاؤں خود نمائی میں
کھُلا پڑا ہوں ہَوا میں کتاب کی صورت

○

لَوٹے سفر سے ہم تو کوئی سائباں نہ تھا
موجود اپنے شہر میں اُس کا مکاں نہ تھا

اب کے ملا تو جیسے ملا تک نہ تھا کبھی
وہ مہرباں کہ پہلے کبھی مہرباں نہ تھا

آنسو بھری نگاہ کے اٹھنے کی دیر تھی
میرا بھرے جہان میں نام و نشاں نہ تھا

شاید تجھے خبر نہیں وہ نامُراد شخص
اِک داستان بن گیا گو داستاں نہ تھا

کیسے کروں یقیں کہ ثمر آپ ہی گرا
شامل مرے زوال میں سنگِ خزاں نہ تھا

دیکھا تو برف زار تھا حدِّ نگاہ تک
اور اُس کے پار، کچھ بھی گراں تاکراں نہ تھا

ٹُوٹے نہ بادبان کہیں ڈر رہا تھا مَیں
مَر جائے گی ہَوا مجھے اس کا گماں نہ تھا"

○

ساون کا مہینہ ہو
ہر بُوند نگینہ ہو

کُوفہ ہو زباں اُس کی
دل میرا مدینہ ہو

آواز سمندر ہو،
اور لفظ سفینہ ہو

نادار ہو دل میرا
وہ ایک خزینہ ہو

موجوں کے تھپیڑے ہوں
پتھر مرا سینہ ہو

خوابوں میں فقط آنا
کیوں اس کا قرینہ ہو

آتے ہو نظر سب کو
کہتے ہو، دفینہ ہو

○

جیسے باہم بن اور گلشن اور طرح کے ہیں
تیرے میرے سارے بندھن اور طرح کے ہیں

تُو برہا کی آگ میں تپ کر رُوپ متی کہلائے
ہم پتھر کے پتھر برہمن اور طرح کے ہیں

آئینوں سے عکسوں نے گھمسان کی جنگ لڑی
عکس عجیب طرح کے، درپن اور طرح کے ہیں

کب سے ہوں مَیں رُکا کھڑا اس تنگ جزیرے میں
جس کی چڑیاں، کوّے، برتن اور طرح کے ہیں

اندر سارا جل تھل، باہر سُوکھے سب آنگن
اب کی بار برستے ساون اور طرح کے ہیں

سیتاؔ جی کا نام بھی سننا کہاں انہیں منظور
آج کے سارے راؔم اور راوؔن اور طرح کے ہیں

ہے نوعمر مکانوں میں اک شوکر پیار بھری
بوڑھے گھر کے ناگ اور ناگن اور طرح کے ہیں

چاپ بھی آئے تو بن جائیں رستوں میں کشکول
میری اس نگری کے دامن اور طرح کے ہیں

اِس بے سمت سے لمحے کا کیا ذکر کریں جس کے
پورب، پچھم، اتّر، دکھّن اور طرح کے ہیں

○

اُس کی بُو باس اگر پردۂ افلاک میں ہے
میری مہکار بھی موجود مری خاک میں ہے

گر بجز خرمنِ جاں کچھ بھی نہیں پاس مرے
پھر یہ کیوں اَبر کی تلوار مری تاک میں ہے

اِس جُدائی کا تجھے رنج نہیں ہے تو بتا
کیسی تحریر سی یہ دیدۂ نمناک میں ہے!

مجھ پہ مرکوز کیے بیٹھا ہے نظریں اپنی
کوئی تو چال دلِ دشمنِ چالاک میں ہے

پھول کی ساری للک تیز ہوا نے چُن لی
اب وہ اِک کشتیٔ خس موجۂ خاشاک میں ہے

عمر کی آخری منزل پہ جو پہنچے تو کھُلا،
اِک عجب مست روی وقت کی پیچاک میں ہے

○

ڈوبتی شام کی صدائیں، سُن
تیز ہونے لگیں ہوائیں، سُن

ایک مدت سے سُن رہا ہوں تجھے
میرے دل کی بھی سائیں سائیں سُن

تیز چابک ہیں دونوں، دن اور رات
مل رہی ہیں ہمیں سزائیں، سُن

آہٹیں ، دھڑکنیں ، دبی آہیں
جاگ اٹھی ہیں پھر بلائیں سُن

اِک نئے حبس کا ہُوا آغاز
بولنے لگ پڑیں گھٹائیں ، سُن

پھول مہکے لہو کے ، سڑکوں پر
بین کرنے لگی ہیں مائیں ، سُن

تُو بھی اے مقبرے کے مالک ، جاگ
پَر فشاں ہیں مری دعائیں ، سُن

دے رہا ہوں مَیں دیر سے دستک
تُو نے کیوں اوڑھ لیں ردائیں ، سُن

پتھروں کی قید میں اِک آبجُو
بیکراں نیلا سمندر ، چار سُو

ریزہ ریزہ ہوگیا ہوں مَیں اگر
چوُر توُ بھی ہو چکا ہے مُو بمُو

ایک چٹکی پیار کی درکار تھی
یار کیوں اتنا ہوا نادار توُ

کون تھا جس نے مجھے تنہا کیا
چھین کر مجھ سے تمہاری آرزو

پھُول کی ریکھائیں اُس نے دیکھ کر
کھینچ دی تصویر میری ہُو بہو

پھُول، خوشبو، رنگ، کاغذ اور مَیں
ہو رہی ہے بے صدا اک گفتگو

لمس اس کی یاد کا، پھر اس کے بعد
میرے اندر مُشکبو ہی مُشکبو

عکس اندر عکس آؤں مَیں نظر
تُو اگر آجائے میرے رُو برو

○

اک عجب روشنی کتاب میں ہے
دیکھتا جیسے کوئی خواب میں ہے

کون کہتا ہے زندگی میری
اک بجھی شمع سیلِ آب میں ہے!

مَیں اگر چاندنی کی قید میں ہُوں
بند تُو بھی تو ماہتاب میں ہے

کیا خبر تھی مَیں ڈھونڈتا ہوں جسے
وہ چھُپا جُملۂ گلاب میں ہے

عہدِ پیری تمام خواب و خیال
جُز لہو کیا رکھا شباب میں ہے!

جانے کیا ہے جو کارواں میں نہیں
اور ٹوٹی ہُوئی طناب میں ہے

○

خزاں پہن کے درختوں کے آس پاس رہا
عجیب شخص تھا اِک عمر بے لباس رہا

ہزار تُو نے بُلایا مگر مَیں بے بس تھا
کرم ہزار کیے پر مَیں ناسپاس رہا

یہ اور بات کہ پہچان سے مَیں عاری تھا
وگرنہ تُو تو ہمیشہ ہی میرے پاس رہا

مَیں کیسا دُکھ تھا کہ تُو جس کو پار کر نہ سکا،
مَیں کیسا قلزمِ خوں تھا کہ تجھ کو راس رہا،

سحر کی اوک سے ٹپکا مَیں کتنی بار مگر،
تُو زرد گھاس کا مخمل تھا، زرد گھاس رہا۔

○

ہے تجھے شوق کہ ملنا ترا آسان نہ ہو
کٹ کے دُنیا سے مگر اتنا بھی سنسان نہ ہو

ہو بجز نکہتِ جاں پاس نہ جس کے کچھ بھی
کوئی ایسا بھی یہاں بے سر و سامان نہ ہو

ہو چکی پھولوں سے محروم تو کہنے لگی شاخ
آج سے ایک بھی پتھر مرا مہمان نہ ہو

اپنے ہونٹوں کو سکھا لفظوں میں ڈھلنے کا ہنر
ضبط اتنا بھی نہ کر اتنا بھی ہلکان نہ ہو

بن نہ جائے یہ بدن میرا لہو کی دلدل،
پیار میں اے مرے دل! اتنا بھی گنجان نہ ہو

لگ چکی ہے تری گرداب کنارے کشتی
اب کوئی فکر نہ کر، اب تو پریشان نہ ہو

○

عُمر کی اس ناؤ کا چلنا بھی کیا رُکنا بھی کیا
کرمکِ شب ہُوں مرا جلنا بھی کیا بجھنا بھی کیا

اک نظر اُس چشمِ تر کا میری جانب دیکھنا
آبشارِ نور کا پھر خاک پر گرنا بھی کیا

زخم کا لگنا ہمیں درکار تھا، پھر اس کے بعد
زخم کا رِسنا بھی کیا اور زخم کا بھرنا بھی کیا

تیرے گھر تک آ چکی ہے دُور کے جنگل کی آگ
اب ترا اس آگ سے ڈرنا بھی کیا لڑنا بھی کیا

در دریچے وا مگر بازار گلیاں مُہر بند
ایسے ظالم شہر میں جینا بھی کیا مرنا بھی کیا

تجھ سے اے سنگِ صدا، اس ریزہ ریزہ دَور میں
اک ذرا سے دل کی خاطر، دوستی کرنا بھی کیا

○

یاد ہے اب تک بدن کا تنکا تنکا جوڑنا
اور پھر پاگل ہوا کا آشیانہ توڑنا

آ رہی ہے بیکراں صحرا سے اک آواز پھر
رخشِ جاں! آواز کی جانب ذرا رُخ موڑنا

اب کسی سنگِ گراں کی جستجو باقی نہیں
آ گیا ہے اب ہمیں دیوار سے سر پھوڑنا

تھک گیا ہوں سنتے سنتے قصۂ شام وسحر
تُو سنا اپنی کہانی ، یہ کہانی چھوڑ، نا!

عُمر کے ان آخری ایّام میں سیکھا تو کیا
آنسوؤں کی ڈور سے ٹوٹے ہوئے پر جوڑنا

○

یہ نقش ریت پہ کس اجنبی قدم کا ہے
کہ دشتِ جاں تو ازل سے اُسی صنم کا ہے

چلو کہ زاویے، قوسیں، کششیں، سبھی اُس کی
فشارِ رنگ تو اپنے ہی مُو، قلم کا ہے

کہاں سے لاؤں مَیں اب عُمرِ خضر تیرے لیے
مرے جہاں کا تو قصّہ ہی دم بہ دم کا ہے

یہ عُمر بھر کی جدائی تو ایک حادثہ ہے
وگرنہ ساتھ ہمارا جنم جنم کا ہے

زمانہ طِفل، لکیروں بھری زمیں تختی،
کمال اس میں کہاں شوخیٔ قلم کا ہے،

مَیں اپنی پلکوں سے کیسے چُنوں گا، تُو ہی بتا
فلک پہ بکھرا پڑا ہار میرے غم کا ہے

○

ہنسے نہ اب کے تو ہنسنے کا پھر سوال گیا
نیا برس مجھے کس مخمصے میں ڈال گیا

چلی گئیں مرے دل سے تو رنجشیں ساری
بتا مجھے کہ ترے دل سے بھی ملال گیا؟

نجانے کب سے تھا میلے بدن کے اندر میں
وہ ایک سایۂ سیمیں مجھے اُجال گیا

مثال، صورتِ سایہ تھی ہر کسی کی مگر
وہ بے مثال ہی آیا تھا' بے مثال گیا

ترے عقب میں بھی تھی غم زدہ سی چاپ کوئی
مگر نہ تیرا کبھی اُس طرف خیال گیا

خزاں کے آ گئے قزّاق برچھیاں لے کر
لُٹا خزانہ کلی کا، گُلوں کا مال گیا

○

کل رات میری چاند سے پھر گفتگو رہی
اک جوئے غم مہکتی ہوئی سُو بہ سُو رہی

کاٹی گُلوں کی سیج پہ کب ہم نے زندگی
میٹھی سی اِک چُبھن تھی سدا مشکبو رہی

اک عُمر ہم بندھے رہے خوشبو کی ڈور میں
تلوار بن کے موجِ ہَوا رُو بہ رو رہی

اے گُل بدن سحر! یہ بتا کس کی یاد میں
آنسو کی گرم بُوند میں محصور تُو رہی

ہم خود کو برف ہوتے ہوئے دیکھتے رہے
سینے میں سانس روکے ہوئے گرم لُو رہی

پلکوں سے کیسے پھوٹیں گی خوابوں کی پتّیاں
آنکھوں میں، یوں ہی خشک اگر آبجُو رہی

بادِ شمال! کچھ تو مرا بھی خیال کر
کیا مَیں رہوں گا تُو جو مرے چار سو رہی

○

تھی نیند میری مگر اس میں خواب اُس کا تھا
بدن مرا تھا، بدن میں عذاب اُس کا تھا

سفینے چند خوشی کے ضرور اپنے تھے
مگر وہ سیلِ غمِ بے حساب اُس کا تھا

دیے بجھے تو ہوا کو کیا گیا بدنام
قصور ہم نے کیا، احتساب اُس کا تھا

یہ کس حساب سے کی تُو نے روشنی تقسیم،
ستارے مجھ کو ملے، ماہتاب اُس کا تھا

فلک پہ کرچیاں، آنکھوں میں موتیا آنسو
جو ریزہ ریزہ ہُوا آفتاب، اُس کا تھا

مری ذرا سی چمک کو کڑک نے ٹوک دیا
سوال مجھ سے کیا تھا جواب اُس کا تھا

کھُلی کتاب تھی پھُولوں بھری زمیں میری
کتاب میری تھی رنگِ کتاب اُس کا تھا

○

دیے اگر وہ ترے شہر کے بُجھا دیتے
ستارے ہم بھی کہیں سے تجھے منگا دیتے

بُلا لیا ہمیں ہوتا اگر سمندر نے
تو ہم بھی کشتیٔ جاں داؤ پر لگا دیتے

بتائیں کیا کہ اُداسی تو اپنی عادت ہے
جو ہوتی دل میں کوئی بات تو بتا دیتے

فشارِ غم کا اگر دیکھنا ضروری تھا
تو میرے حصّے کا غم ابر کو دلا دیتے

دیا جواب نہ تُو نے تو ہم برہنہ پا،
گئے، پہاڑ کی جانب۔ تجھے صدا دیتے

نہ حرف حرف مٹایا گیا ہمیں ورنہ
ہم اپنے مٹنے کا منظر تجھے دکھا دیتے

ہَوا پہ ہو گا تجھے اعتبار ہم کو نہیں
"ہَوا کو کیسے ترے شہر کا پتہ دیتے"

○

اُڑی جو گرد تو اِس خاکداں کو پہچانا
پھر اس کے بعد دلِ بے نشاں کو پہچانا

جَلا جو رزق تو ہم آسماں کو جان گئے
لگی جو پیاس تو تیر و کماں کو پہچانا

چلو یہ آنکھ کا جل تھل تو تم نے دیکھ لیا
مگر یہ کیا کہ نہ ابرِ رواں کو پہچانا

بہار آئی تو ہر سُو تھیں کترنیں اس کی
بہار آئی تو ہم نے خزاں کو پہچانا

خود اپنے غم ہی سے کی پہلے دوستی ہم نے
پھر اس کے بعد غمِ دوستاں کو پہچانا

سفر طویل سہی حاصلِ سفر یہ ہے
وہاں کو بھُول گئے اور یہاں کو پہچانا

زمیں سے ہاتھ چھُڑایا تو فاصلے جاگے
مگر نہ ہم نے کراں تا کراں کو پہچانا

عجب طرح سے گزاری ہے زندگی ہم نے
جہاں میں رہ کے نہ کارِ جہاں کو پہچانا

○

یہ بھی نہیں کہ اُس کی نظر مہرباں نہ تھی
اپنی نظر ہی درپئے آزارِ جاں نہ تھی

کوئی تو بات ہے کہ معاً چُپ ہوئے ہو تم،
ورنہ زباں تمہاری، کبھی بے زباں نہ تھی

بے پردگی تھی پھیلی ہوئی دُور دُور تک
آنسو کی اک ردا بھی کہیں درمیاں نہ تھی

اتنا تو بے کنار کبھی آسماں نہ تھا
اور ارضِ خاک اتنی کبھی بے نشاں نہ تھی

چھوٹا سا ایک دیپ مری آنکھ میں تو تھا
قندیل تیرے دل میں اگر ضو فشاں نہ تھی

اُجڑے اداس پیڑ کو دیکھا تو رو پڑی
نادان اس قدر بھی ہوائے خزاں نہ تھی

شامل تھی داستاں میں کہانی اِک اور بھی
ورنہ طویل اتنی مری داستاں نہ تھی

○

یاد اُس کی دھیرے دھیرے جائے گی
جا کے بھی سو بار واپس آئے گی

رات کے بکھرے ہوئے موتی تمام
دانہ دانہ صبح چُگتی جائے گی

بند آنکھوں ہی سے اُس کو دیکھنا
آنکھ کھولی تو نظر پتھرائے گی

دم بہ دم اِس برف ہوتے عہد کو
ٹمٹماتی شمع کیا گرمائے گی

دفعتاً چُپ ہو گیا سارا نگر
اب طبیعت اور بھی گھبرائے گی

عالمی ہے مسکراہٹ کی زباں
یہ زُباں سیکھو بہت کام آئے گی

کھا چُکی تُو زخم کتنے میری جاں!
اور کتنے زخم اب تُو کھائے گی

یہ کس پتھر کو اُس نے آ لیا ہے
کہ دھارا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے

مَیں کرتا عُمر بھر اُس کی تمنّا
مگر کب عمر بھر کوئی جیا ہے!

چراغ اک دن الہ دیں کا بنے گا
ابھی وہ جلتا بُجھتا اک دیا ہے

اِسے سی لوں تو تیرا ساتھ دوں مَیں
بدن پھر کترنوں سے بھر گیا ہے

رہے بے رنگ اور بے نام برسوں
کبھی گر نام تیرا لے لیا ہے

کسی سے پُوچھتے بھی ڈر رہا ہوں
بچا کیا شہر میں، کیا جل گیا ہے!

○

Wazir Agha's poem 'A Tale So Strange' is a truly universal poem. I was at once struck by the richness of its language, the vigorous pace, the perfect architecture of its narrative presentation, and the tight control of its developing central images; but with each reading I came closer to the largeness of its vision and the prophetic urgency of its warn ing.

AARON KRAMER
(U.S.A)